اُردو کے نثری داستانی ادب میں نمائندہ تنقیدی رجحانات

Remarkable Critical Tendencies in Urdu Prose Dastaani Literature

ڈاکٹر ثمینہ سیف
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین سمن آباد، لاہور

Abstract:

Criticisms of Urdu Dastani literature contain a diverse range of critical tendencies and their changing trends as well as new thoughts and ideas. Due to the wisdom and abilities of critics with different tastes and different thinking, the horizon of fictional criticism is not only colorful and beautiful, but it also encompasses universality. It is a mirror of our cultural, historical, religious and social conditions in which all the trends of modern and ancient art of critical theories of literature, linguistics, history, sociology, spirituality, femininity, anthropology, psychology, metaphysics, modernity and philosophy are present.

کلیدی الفاظ؛ وقار عظیم، لسانیات، بیتال پچیسی، کام کندلا، ارتضیٰ کریم، شمس الرحمان فاروقی

داستان بنیادی طور پر زبانی بیانیہ ہے جس میں لطافت، شیرینی بیان، دل آویز چاشنی اور دلچسپی و دبستگی کے سارے چٹخارے اور لوازمات موجود ہیں لیکن ان میں نصیحت، مذہب اور اخلاق کی تبلیغ بھی جابجا ملتی ہے۔ یہاں انسانی معاشرت کے عہد بہ عہد حالات سے معلومات حاصل ہوتی ہے، جہاں ایک طرف حسن و عشق کی رعنائیاں اور کیف و سرمستی کی بزم آرائیاں ہیں تو وہیں دوسری طرف وحشت و ہیبت کا عالم بھی موجود ہے۔ قدیم زمانے کے جغرافیائی، سیاسی، سماجی، تمدنی، تہذیبی، لسانی، مذہبی، نفسیاتی اور ادبی عوامل اگر ادب میں تلاش کرنا چاہیں تو وہ داستان کی صورت میں ہمیں میسر ہیں۔ ادب میں تخلیق اور تنقید کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ داستانی ادب کا ارتقائی عمل اس کی تخلیق کے ہی اس پر تنقید سے راست تناسب میں شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی نثری داستانیں احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے داستان گوؤں نے مقدمات میں اصول نقد بھی وضع کیے ہیں۔ اس بات میں ہرگز دورائے نہیں ہے کہ عصر حاضر کی تنقیدی عمارت کی بنیاد داستان گوؤں کے مقدمات پر استوار ہے۔

بیسویں صدی میں جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں انقلاب آیا وہاں قدیم ادب کے متعلق ادیبوں اور نقادوں کے تصورات و خیالات میں بھی خوشگوار تبدیلی آئی۔ نقادوں کی کثیر تعداد نے داستانی ادب کی طرف

رُخ کیا اور اِسے اُردو کا وقیع سرمایہ قرار دیتے ہوئے اس کے دامن میں صدیوں پہلے کے انسانوں کے تخیل، عقائد، رجحانات، انداز فکر اور فنی و ادبی پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ ان نقادوں میں کلیم الدین احمد (۱۹۸۳ء۔۱۹۰۸ء)، ڈاکٹر گیان چند جین (۲۰۰۷ء۔۱۹۲۳ء)، سید وقار عظیم (۱۹۷۶ء۔۱۹۱۰ء)، ڈاکٹر سہیل احمد خاں (۲۰۰۹ء۔ ۱۹۴۸ء)، ڈاکٹر سہیل بخاری (۱۹۹۰ء۔۱۹۱۴ء)، ڈاکٹر آغا سہیل (۲۰۰۹ء۔۱۹۳۳ء)، ڈاکٹر آرزو چودھری، شمس الرحمن فاروقی (۲۰۲۰ء۔۱۹۳۵ء) اور قمر الہدیٰ فریدی وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں۔ جبکہ مختلف داستانوں پر مقدمات، مضامین اور کتب لکھتے ہوئے محمد حسن عسکری (۱۹۷۸ء۔۱۹۱۹ء)، ڈاکٹر وحید قریشی (۲۰۰۹ء۔۱۹۲۵ء)، رشید حسن خاں (۲۰۰۶ء۔۱۹۲۵ء)، سید ابوالخیر کشفی (۲۰۰۸ء۔۱۹۳۲ء)، ممتاز حسین (۱۹۹۲ء۔۱۹۱۸ء)، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (۱۹۴۰ء)، ڈاکٹر راہی معصوم رضا (۱۹۹۲ء۔۱۹۲۵ء)، سید سلیمان حسین اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (۱۹۵۹ء) وغیرہ نے خاطر خواہ تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُردو نثری قصوں کی ابتدا دکن میں ''سب رس'' سے ہوئی، یہ ایک عارفانہ تمثیل ہے جس میں رومانی داستان معرفت کے لبادے میں بیان کی گئی ہے۔ بعد ازاں شمالی ہند میں ''قصّہ مہر افروز و دلبر''، ''نو طرزِ مُرصّع''، ''قصہ ملک محمد وگیتی افروز'' ''عجائب القصص'' اور ''جذبِ عشق'' جیسی معروف نثری داستانیں احاطہ تحریر میں لائی گئیں۔

فورٹ ولیم کالج نے نثری داستانوں کو علمی وقعت کا حامل بناتے ہوئے ایک واضح اور منظم منصوبے کے تحت فارسی کے آرائشی رنگ، مشکل پسندی، معنی اوہام اور مبالغہ آرائی سے اُردو نثر کو نجات دلوائی۔ علاوہ ازیں بیرون فورٹ ولیم کالج ''فسانہ عجائب''، ''نورتن''، ''گلشنِ نوبہار''، ''داستانِ امیر حمزہ'' اور ''بوستانِ خیال'' جیسی ضخیم و حجیم داستانیں انیسویں صدی کے آخر تک لکھی گئیں۔ جس طرح اُردو داستانی ادب فارسی داستانی ادب سے مغلوب رہا اور یہ صوری اور معنوی اعتبار سے کافی عرصے تک فارسی کی ڈگر پر ہی گامزن رہا، اسی طرح اُردو داستانی ادب کو جانچنے کا تنقیدی پیمانہ بھی فارسی مروجہ تنقیدی اصولوں پر کاربند رہا۔ قدیم فارسی طرزِ تنقید کی مانند انیسویں صدی میں اُردو داستانوں میں لسانی اور لفظی خوبیوں کو تلاش کرتے ہوئے معنوی پہلوؤں کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق (۱)، حافظ محمود شیرانی (2)، ڈاکٹر مسعود حسین خان (3)، نورالحسن ہاشمی (4) اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (5) کے تنقیدی خیالات بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں، جو انھوں نے اٹھارویں صدی میں لکھی گئیں داستانوں پر مقدمات یا مضامین کی صورت میں رقم کیے ہیں۔

مزید برآں اسلوب کے حوالے سے داستانی ادب کی تنقید کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ نقادوں نے بڑی خوبصورتی سے اُردو داستانوں اور اُن کے اصل ہندی، فارسی اور سنسکرت مآخذ کے حوالے سے اسالیب میں جذبات و خیالات کی ترسیل کی مدد سے بتدریج دو مختلف ادوار کے مزاج کو سمجھنے کی سعی بھی کی ہے، مثلاً ڈاکٹر اسلم قریشی (6) اور ڈاکٹر آرزو چودھری (7) نے ''آرائشِ محفل'' از حیدر بخش حیدریؔ پر

تنقید کرتے ہوئے داستان گو اور داستان کے اصل ماخذ یعنی کہ فارسی ادب کی روایت کو بھی تنقیدی بصارت و جسارت سے بیان کیا ہے۔ یوں داستان کو دو مختلف تہذیبی و ادبی تناظر اور دو مختلف ادوار میں رکھ کر جانچنے کا انداز ڈاکٹر گیان چند جین کے ہاں بھی نمایاں نظر آتا ہے، انھوں نے عربی و فارسی تہذیب کے حوالے سے ''داستانِ امیر حمزہ'' اور ''آرائشِ محفل'' کو اپنی تنقیدی بحث کا حصّہ بنایا جب کہ ہندی اور سنسکرت معاشرت کے پیشِ نظر ''بیتال پچیسی''، ''سنگھاسن بتیسی''، ''شکنتلا'' اور ''قصہ مادھونل کام کندلا'' کو اپنے تنقیدی موضوع کے دائرہ کار میں لائے۔(8) غرض یہ کہ نقادوں نے داستانی ادب میں نہ صرف متعدد اسالیب بیان کے اثرات دیکھے بل کہ انھوں نے داستان گوؤں کے طرزِ نگارشات میں سادگی و رنگینی اور مشکل پسندی و عام فہمی کے رجحانات کو بھی بیان کرتے ہوئے داستانی تنقید کو نمکینی و لطافت کا مرکب بنایا ہے۔

اُردو داستانی ادب جو اجتماعی تخیل کا پیدا کردہ ہے، نقادوں نے اس تخیل میں جہاں نئی ہیئتیں متعارف کروائی ہیں وہاں ناممکنہ موجودات کو ممکنہ موجودات بنایا ہے، انھوں نے داستانی تخیل میں سرحدوں، مذاہب اور ہیتوں سے بالاتر انسانیت کا درس عیاں پایا ہے۔ مثلاً ''مذہبِ عشق'' از نہال چند لاہوری میں ڈاکٹر جیلانی کامران (9) اور ''الف لیلہ'' میں مظفر علی سید (10) نے ان داستانوں میں چھپے ہوئے فلسفیانہ خیالات، اخلاقی نتائج، علم المعاشرت، سیاست اور انسانی فطرت کے سبھی رازہائے سربستہ کو کھوج کر مفصل بیان کیا ہے۔

''بیتال پچیسی'' پر جرمن ماہر لسانیات ہائنرخ سمر کے مضمون کا ترجمہ محمد سلیم الرحمن نے ''شر پر روح کی فتح'' کے عنوان سے کیا ہے۔ انھوں نے مذکورہ داستان کے تناظر میں انسانی زندگی کے جسمانی اور روحانی سفر کو بیان کیا ہے، جس میں باطن و ظاہر، شعور و لاشعور، نیکی و بدی، فرائض و حقوق، خواہشات و الجھنیں اور کامیابیاں و ناکامیاں انسان کی راہ میں حائل ہیں۔ علاوہ ازیں تقدیر سب پر حاوی ہوتے ہوئے آخر میں غیر متوقع انجام سے دوچار کرواتی ہے۔ راجہ ہو یا کوئی عام انسان یہ سفر سبھی کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ''بیتال پچیسی'' میں راجہ اور جوگی کے سفر کو تمثیلی قرار دیتے ہوئے محمد سلیم الرحمن کا یہ ماننا ہے:

> ''آدمی خواہ بڑی تمکنت سے ایوان عالیشان میں متمکن ہو، اپنے ماضی کی لاشوں اور بھوتوں میں گھرا عذاب جھیل رہا ہو، کبھی اپنے محیط اور ذات کی حدود سے ایک قدم بھی آگے نہیں جاتا۔ یہ دُنیا بھی ہم ہی ہیں اور اوپر فلک تک اور نیچے پاتال تک جتنے جہاں ہیں وہ بھی ہم ہی ہیں۔''(11)

بیسویں صدی کے نصف آخر میں نئے رجحانات کے در آنے سے داستانی ادب کے تنقیدی خیالات میں نفسیاتی، سیاسی، سماجی اور عمرانی زندگی سے ہم آہنگی کے تصورات کی صورت بھی موجود ہے۔ نقادوں نے داستانی ادب کی تنقید میں بنیادی حوالہ تو مصنف اور فن پارہ کو ہی بنایا ہے مگر اس کے علاوہ انھوں نے ادب پارے کے عہد اور اس سے متعلقہ مخصوص نظریات و رجحانات کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ اس طرز تنقید میں سید وقار عظیم کا

نام سر فہرست ہے۔ داستانی ادب کی تنقید میں انھیں یہ تفوق حاصل ہے کہ وہ مخصوص عصری مزاج، سماجی محرکات، تاریخی شعور اور معاشرتی عوامل کے پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ انھوں نے تشریحی و توضیحی طریقہ تنقید اپناتے ہوئے ”رانی کیتکی کی کہانی“، ”بیتال پچیسی“، ”فسانہ عجائب“ اور ”قصہ اگر و گل“ میں سماجی اسباب و علل اور عمرانیاتی حوالوں سے اپنے موقف کو دلکش بنایا ہے۔(12) سید وقار عظیم نے گہرائی اور غور و فکر سے داستانی ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے نیکی اور بدی کے علامتی تصور کو اُجاگر کیا ہے۔ مزید برآں انھوں نے داستانی عہد کے انسان اور اس کے ذہن کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں ہماری داستانیں حسن، صداقت اور خیر کا منبع ہیں جن کے تخیل میں زندگی گزارنے کا تصور موجود ہے۔ سید وقار عظیم کی نظر داستان گوئی، داستانی ادب اور اس سے متعلقہ عہد اور ماحول پر گہری اور بسیط ہے۔ انھوں نے اپنے معتدل رویوں، انتقادی بصیرتوں اور سائنسی فکر سے اُردو کے نثری داستانی ادب کو نئے تناظر سے روشناس کرواتے ہوئے اس کے تنقیدی معیار کو اونچا کیا ہے۔

داستانی ادب کی تنقید میں ایک معتبر نام کلیم الدین احمد کا ہے، انھوں نے باضابطہ طور پر ”اُردو زبان اور فن داستان گوئی“ کے عنوان سے کتاب لکھتے ہوئے اربابِ فکر و نظر کو اُردو داستانوں کی افادیت و اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ کلیم الدین احمد داستانی ادب کے وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے خواجہ امان دہلوی کے بعد پہلی بار باضابطہ طور پر داستانوں کے معائب و محاسن، اصول و ضوابط، داستانی تکنیک، فنی و ادبی حوالوں اور اس کے عناصر ترکیبی پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ہم بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ داستانی ادب کی تنقید میں عملی تنقید کا سہرا کلیم الدین احمد کے سر سجتا ہے۔ داستانی ادب کے تنقیدی افق پر نظری تنقید کے حوالے سے ان کے خیالات و نظریات لائق صد ستائش ہیں۔ اس ضمن میں شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

> ”کلیم الدین احمد کے علاوہ کسی نے داستان پر اتنی مفصل نظری تنقید نہیں لکھی ہے۔ کلیم الدین احمد ہی کے خیالات کی بنا پر آج تک کے تقریباً تمام نقادوں نے داستان پر اپنی تنقید کی عمارت قائم کی ہے۔ کلیم الدین احمد نے داستان کو سنجیدہ مطالعے کے لائق سمجھا اور اس کے معائب و محاسن پر ادبی نقطہ نگاہ سے بحث کی۔ بالفاظ دیگر انہوں نے ہماری داستانوں کو باعزت بنایا۔ اس کے لیے جتنی ثنا ہو، کم ہے۔“(13)

داستانی ادب کی تنقید میں تقابل، امتیاز، تجزیہ اور تعین قدر کی بہترین آمیزش کلیم الدین احمد کے ہاں موجود ہے۔ نیز ان میں دیگر دوسرے داستانی نقادوں کی نسبت قوت فیصلہ قدرے زیادہ ہے۔ انھوں نے بڑی حکمت اور جامعیت کے ساتھ اُردو داستانی ادب کے پھیلے ہوئے ادبی مواد کا نہ صرف فکر انگیز تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ادبی احیا کا عظیم کارنامہ سر انجام دیا بلکہ عصر حاضر کے ادیبوں کو یہ ہدایت نامہ دیا کہ وہ داستانوں سے

استفادہ حاصل کر کے بہترین ادب تخلیق کر سکتے ہیں۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ داستانی ادب کی تنقید میں انھوں نے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ تنقیدی موقف اختیار کیا ہے جس سے اُردو ادب کی دوسری اصناف محروم رہی ہیں۔

انگریزی ادبیات سے استفادہ کلیم الدین احمد کے عقل و شعور میں سرایت کر چکا تھا، جو داستانی ادب کی تنقید میں تقابلی مطالعات کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر انگریزی و عالمی ادب سے موازنہ کرتے ہوئے اُردو داستانی ادب کو فوقیت دی ہے۔ ان تقابلی جائزوں میں انھوں نے استدلال اور عمیق مطالعے سے داستانی ادب میں نئے تنقیدی رجحانات کو فروغ دیا ہے۔ جن میں تاریخی حقائق، تحقیقی نظر، تخلیقی سوچ، سائنسی رجحان، مثبت تنقیدی نقطہ نظر اور استدلالی طریقہ کار کا حسین امتزاج موجود ہے۔ مشرقی مزاج و روایات سے لگاؤ اور یورپی ادب و علوم سے آگہی کے باعث ان کی تنقید مشرق و مغرب کے ادب کے انضمام و مرکب کی خوبصورت نمونہ ہے۔

داستانی ادب میں تنقید کو تحقیق سے ہم آہنگ کرنے کی بنیاد ڈاکٹر گیان چند جین نے ڈالی ہے، اس حوالے سے وہ داستانی ادب کے نقادوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ داستانی ادب کی لسانی و ادبی اہمیت واضح کرنے کے لیے وہ تنقید کا سہارا لیتے ہیں جب کہ داستان، داستان گو اور مآخذ کی تلاش کرتے ہوئے وہ تحقیق کی ڈگر پر چلتے ہیں۔ اُردو داستانی ادب پر تنقید کرتے ہوئے وہ فراموش شدہ ثقافتی علامتوں کی دریافتِ نو کر کے ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہوئے اُردو داستانوں کا تقابلی جائزہ عالمی، ہندی، عربی اور فارسی ادب سے بھی کرتے ہیں۔ بطور داستانی نقاد، محقق اور مورخ ان کی تصنیف ''اُردو کی نثری داستانیں'' ایک ایسا گلہائے رنگین گلدستہ ہے جس میں عصر حاضر کے قاری کی تفہیم کا سامان موجود ہے۔ جس طرح ڈاکٹر گیان چند جین کی علمی و ادبی شخصیت ہمہ جہت ہے اسی طرح ان کے تنقیدی نظریات بھی وسیع، ہماگیر اور کثیر رنگی ہیں۔ تنقید کے مختلف شعبوں سے آگاہی رکھتے ہوئے انھوں نے مرکب قسم کا نظام اختیار کیا ہوا ہے مثلاً داستانی تنقید کے حوالے سے انھوں نے ہر داستان کی تاریخی جہت، لسانی جہت، سماجی جہت اور تہذیبی جہت سے رجوع کیا ہے علاوہ ازیں ان کے ہاں مارکسی تنقیدی مکاتب خیال کے اثرات بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین ہر داستان کو اپنی معاشرت اور سماج کا آئینہ قرار دیتے ہوئے سوا تین سو سال کے نثری داستانی ادب میں معاشرت کا پھیلاؤ دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''عام طور پر یہ معاشرت ہند، ایرانی یا مغل شاہی ہے اس میں کہیں محمد شاہی دلی کا شکوہ ہے تو کہیں نوابینِ اودھ کا طمطراق پرے جمائے ہے۔ باغ و بہار، فسانہ عجائب اور داستان امیر حمزہ میں دلی اور لکھنو کی زندگی کے کئی پہلو جگ مگ جگ مگ جھلکیاں دے رہے ہیں۔ فسانہ عجائب کے دیباچے میں نصیر الدین حیدر کا لکھنو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظروں کے سامنے سے

گزر جاتا ہے۔ بھولے بھٹکے دوسری تہذیبوں کے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، رانی کیتکی کی کہانی میں قدیم ہندوستان اپنے راجاؤں اور جوگیوں، راج کماریوں اور باندیوں کو جلوس میں لیے موجود ہے۔ تو الف لیلہ کی کہانیوں میں شب رو خلیفہ ہارون الرشید کا بغداد، بصرہ اور موصل دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔"(14)

دوسری جنگ عظیم کے بعد رویوں کے بدلنے سے طرزِ سوچ میں نمایاں فرق آیا تو دیگر اصناف ادب کی مانند داستانی ادب کے نقادوں کے خیالات میں بھی تبدیلی آئی۔ اسی اثنا میں ان داستانی نقادوں نے انقلاب انگیز تنقیدی خیالات سے داستانی ادب میں متنوع نظریات و رجحانات متعارف کروائے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے داستانوں کی ساخت پر کھتے ہوئے مختلف رمزوں کو آشکار کیا۔ "آرائشِ محفل" میں حاتم طائی کی سات مہمات کو انھوں نے اگر انسانی باطن کا سفر کہا تو اس ضمن میں انھوں نے مختلف قدیم ثقافتوں اور عالمی تہذیبوں میں غواصی کرتے ہوئے علم بشریات اور نفسیات کے مختلف نقطہ ہائے نظر سے ہیروز کے باطنی اور ظاہری مراحل کے نہاں خانوں کے رموز کو ظاہر کیا ہے۔ نیز انھوں نے "فسانہ عجائب"، "آرائشِ محفل" اور "مذہبِ عشق" میں تبدیلی قالب جیسے موضوع کو جرمن، فرانسیسی اور لاطینی ادب میں ڈھونڈتے ہوئے علامتی و تمثیلی بیانیے کی تہیں کھولی ہیں۔

ایک صاحب فکر نقاد ہوتے ہوئے ڈاکٹر سہیل احمد خاں اس بات سے بہ خوبی آگاہ تھے کہ اُردو کا داستانی ادب اپنے دامن میں صدیوں کے ثقافتی و سماجی میلانات اور ادبی و جمالیاتی احساسات کے خزینے پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ داستانوں کی وسعت کو جانچنے کے لیے داستان گوؤں کی ذات میں تخیلاتی شعور و لاشعور کی کارفرمائیوں کو ٹٹولتے ہیں اور داستانی کرداروں میں باطنی و خارجی انسانی وارداتوں و کیفیتوں میں علامتی و استعاراتی مفاہیم کو بھی کھوجتے ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے نئے منطقی اور سائنسی زاویوں سے تنقید کرتے ہوئے ان داستانوں میں انسانی حقیقتوں اور سچائیوں کو دکھایا ہے۔ انھوں نے داستانی ادب کے قدیم ورثے کو جدید اور عالمی ادب کے مزاج سے ہم آہنگ کیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے "اُردو داستان" میں بالخصوص داستانی ادب کے اصول و ضوابط اور اس کی شعریات پر روشنی ڈالی ہے اور بالعموم داستان اور ناول کے درمیان بنیادی فرق کو واضح کیا ہے۔ داستانی ادب کی تنقید میں لکھنویت کی تلاش میں ڈاکٹر نیر مسعود رضوی، محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر آغا سہیل کی تنقیدات بہترین کاوشیں قرار دی جاسکتی ہیں۔(15) ان جید نقادوں نے مثبت، معتدل، مناسب اور غیر جانبدارانہ تنقیدی رویے اپناتے ہوئے لکھنوی داستانی ادب کا تہذیبی تجزیہ بھی کیا اور معروضی انداز سے داستانی تنقید کے اصول و ضوابط کو بھی پرکھا ہے۔ بلاشبہ ان نقادوں کے تنقیدی زاویہ ہائے نظر میں وسعت اور حقیقت پسندی جھلکتی ہے، انھوں

نے جدیدیت کے شوق میں روایت کا خون نہیں ہونے دیا اور اُردو کے قدیم ادب کو جدید مزاج اور عصر حاضر کے شعور سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اسے خود اعتمادی عطا کی ہے اور اس کی معنویت، افادیت اور بلاغت کو تنقیدی شعور سے اُجاگر کر کے اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے۔ ''اُردو داستانوں میں ویلن کا تصور'' میں شفیق احمد شفیقؔ نے ناقدانہ فکر سے ویلن کے کردار کو سیاسی اور سماجی سیاق و سباق سے نئے انداز سے موٹی موٹی اصطلاحوں کے بغیر سادگی سے بیان کیا ہے۔ ''باغ و بہار'' اُردو کی وہ خوش قسمت داستان ہے جسے مولوی عبدالحق سے لے کر ڈاکٹر سلیم اختر تک درجنوں مرتبین اور نقادوں نے مقدمات اور مضامین کی صورت میں اپنی تنقیدی بحثوں کا حصّہ بنایا ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید میں تاریخی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ ابو الخیر کشفی، ممتاز حسین اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کو اس داستان میں روحانیت کا پہلو نظر آیا۔ الغرض ''باغ و بہار'' کی تنقید میں جدید نظریات کا چلن ہے جو اس کی دلکشی اور حسن کو جلا دینے کے موجب ہیں۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں داستانی ادب کی تنقید کو شمس الرحمن فاروقی جیسا نقاد نصیب ہوا جنھوں نے نئے تحقیقی و تنقیدی مباحث چھیڑے۔ انھیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے داستانی ادب کے پرانے منجمد تنقیدی اصولوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جنھوں نے نہ صرف داستانی ادب کی تخلیقی قوتوں پر غیر حقیقی اور غیر فطری ہونے کی مہر لگا رکھی تھی بل کہ داستانی ادب کی تنقید کو زنگ آلود کیا ہوا تھا۔ شمس الرحمن فاروقی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے عملی و نظری تنقیدی مباحث سے داستان اور ناول کی کائنات سے وابستہ بہت سے مروجہ روایتی تنقیدی نظریوں اور رویوں سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے تنقیدی اصول و ضوابط اور کلیے خود تشکیل دیئے ہیں۔ ''داستانِ امیر حمزہ'' کے تنقیدی جہان کے باطن میں کمند اندازی کرتے ہوئے انھوں نے داستان کی شعریات، زبانی بیانیہ، نظریہ زمان و مکان، کردار نگاری، کہانی پن، تجسّس، مکالمہ نگاری، جزئیات نگاری، المیہ کا عنصر، داستانی جغرافیہ، داستانی ادب میں حافظہ اور فی البدیہہ اختراع، پلاٹ، اسلوب، فلیش بیک، سحر و طلسم اور رزم و بزم جیسے اہم عناصر کے حوالے سے حیات خیز تنقیدی نظریات اخذ کیے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے ان عناصر کی سنسکرتی، فارسی، عربی، ہندی، انگریزی، جرمنی، چینی، افریقی اور فرانسیسی ادبوں اور روائتوں کے زبانی بیانیوں میں نشاندہی کرتے ہوئے داستان کو ایک بین الاقوامیت فن اور داستان کی دُنیا کو اپنی ہی طرح آفاقی قرار دیا ہے۔(16) چوں کہ مختلف تہذیبی روایتیں شمس الرحمن فاروقی کے مطالعے کی جولان گاہ تھیں اسی لیے تجزیاتی اور تقابلی طریقہ ہائے تنقید کے حوالے سے ان کے ذہن کو مشرق و مغرب اور کلاسیکیت و جدیدیت کے ہشت پہلو نظریات سے آگہی حاصل تھی، جس کا بہ خوبی اندازہ ان کی داستانی تنقید سے لگایا جا سکتا ہے۔

داستانی ادب کی تنقید میں مذکورہ بالا تمام رجحانات کی بدولت اُردو داستانیں گم گشتہ ماضی سے نکل کر عصری زندگی کی ترجمان بنتے ہوئے قدر و منزلت کے اعلیٰ رتبے پر فائز ہوئی ہیں۔ سید وقار عظیم اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے تنقیدی تجزیوں میں وجدانی دُنیا کا تجربہ محسوس کیا جا سکتا ہے اور یہاں تخلیقی لمحات کا ذکر بھی موجود ہے علاوہ ازیں انھوں نے کرداروں کو داخلی و خارجی سطحوں پر پرکھتے ہوئے تغیر پذیر و غیر تغیر پذیر، خیالی و حقیقی، معتدل و توازن اور مثالیت و مصنوعی وغیرہ کثیر ہائے زاویہ نظر پیش کیے ہیں۔ جب کہ کلیم الدین احمد، ڈاکٹر گیان چند جین اور شمس الرحمن فاروقی نے عملی، نظری اور ہیتی تنقید سے داستانوں کے اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا ہے اور داستانی ادب میں تقابلی اور تجزیاتی تنقید کے حوالے سے اُردو داستانی ادب کا موازنہ مختلف عالمی ادبوں سے کرتے ہوئے داستانی تنقید کو وسیع تر تناظر عطا کیا ہے اور تمام اقوام عالم کے داستانی ادب میں طلسمات و سحر سے مزین و منقش واقعات میں تخلیقی بلند پروازیوں اور تصور کی ندرت آفرینیوں کی ستائش کی ہے۔ یوں ان تقابلی مطالعات سے ایک طرف عالمی سطح پر تنقیدی و تجزیاتی رویوں اور نظریات کی بہتر طور پر تشکیل ہوئی ہے تو دوسری طرف داستانی تنقید میں تعصب، جمود اور تنگ نظری کا خاتمہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے اپنے مقالہ ''داستانوں کی علامتی کائنات'' اور ڈاکٹر جیلانی کامران، محمد سلیم الرحمن اور شمیم احمد نے مختلف مضامین میں تنقیدی حوالوں سے داستانی دُنیا کے تمام پیچیدہ نفسیاتی اور مابعد الطبیعاتی تعبیروں کو کہانی کی علامتی سطح اور انسانی باطن کی استعاراتی معنویت سے روشناس کیا ہے جس سے اس کے مختلف مطالب اور مفاہیم تخلیقی اظہار کے ضامن بنے ہیں۔ انھوں نے معنی خیز انداز سے داستان کی کائنات میں استعاروں اور تلازموں کو انسانی زندگی سے مربوط کیا اور داستانی تخیل کو ہمہ گیریت اور آفاقیت سے ہم کنار کیا۔

ہر فنکار کی مانند نقاد بھی اپنے مخصوص عہد کے رجحانات اور نظریات سے متاثر ہوتا ہے نیز وہ اپنی ذات اور شعور و لاشعور کا بھی پابند ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی ایک داستانی ادب کے نقاد کے بنائے ہوئے مخصوص اصول و قوانین کسی بھی ایک داستان کی تنقید کے مطالعے کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتے ہیں تو پھر ایک تنقیدی اصول تمام نثری داستانوں کی وسیع و پیچیدہ تنقیدی سوچ اور گنجلک تخیلات پر کیسے عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی نقاد تاریخی اور سماجی حقائق پر زور دیتا ہے۔ کوئی تحلیل نفسی اور نفسیات کے نہاں خانوں میں غوطہ زنی کرتا ہے۔ کوئی ادب کو سماج کا آلہ کار تصور کرتا ہے اور کوئی جمالیاتی، تاریخی، دستاویزی اور تاثراتی پہلو کو اہم قرار دیتا ہے۔ چوں کہ داستانی ادب کے نقادوں مختلف ذہنی تربیت اور رجحانات رکھتے ہیں اِس لیے ان کے یہاں داستانوں کی تنقید اور پرکھ میں یکسانیت ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منثور داستانی ادب کی تنقید کے بہت سے رجحانات و نظریات وجود میں آئے ہیں جو عصر حاضر کے اُردو دان طبقے کے لیے تشفی بخش مطالعہ کا ذریعہ ہیں۔ مذکورہ بالا تمام تنقیدی رجحانات نے داستانوں کو ماضی سے نکال کر عصری زندگی کا ترجمان بناتے ہوئے اس کی قدر و منزلت

میں اضافہ کیا ہے۔ بلاشبہ داستانی ادب کے یہ تنقیدی رجحانات ہمارے تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کے عکاس ہیں جن میں ادب برائے ادب، ادب برائے سماج، روحانیت کے فلسفے، جمالیات کے پہلوؤں اور عمرانی تنقید کے بنیادی اور عملی اصولوں سے بالخصوص اُردو داستانوں اور بالعموم مشرقی تہذیب و تمدن کی بہتر تفہیم ہوتی ہے۔ داستانی ادب کی تنقید میں بدلتے حالات و رجحانات اور نئی فکر و نظر کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کے سہارے تنقید کا یہ افق ہمہ گیریت اور آفاقیت سے ہم کنار ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ داستانی ادب کی تنقید میں دیگر اصناف کی تنقید کے برعکس لمبے لمبے مغربی مفکرین کے اقتباسات و مقالات دیکھنے کو شاذو نادر ہی ملتے ہیں، حالاں کہ تمام جدید مغربی تنقیدی رجحانات و خیالات مثلاً حقیقت نگاری، تانیثیت، عمرانیات، مابعد الطبیعات، نفسیات، سیکولرازم، تاریخیت، لسانیات، بشریات، اقتصادیات، جدیدیت اور نو آبادیاتی نظام سے متعلقہ مباحث کے جدید و قدیم نظریات کا داستانی ادب کی تنقید میں چلن ہے۔ اس میں ہرگز دو رائے نہیں ہے کہ یہ داستانی تنقید اپنے کثیر رنگی رجحانات کے سہارے اُردو ادب میں ایک مستقل اور منفرد حیثیت رکھتی ہے جس میں ہماری سماجی زندگی کی عکاسی موجود ہے جو سمندر پار سے اخذ کردہ نظریات سے تقریباً پاک ہے۔ بلاشبہ اُردو داستانی ادب کا یہ سرمایہ نقد اپنے دامن میں وسیع اور گہرے امکانات و موجودات کی بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ یہ تنقیدی سرمایہ کسی بھی دوسری اصناف کے ادبی تنقیدی سرمائے سے نہ کم عیار ہے اور نہ ہی باعث ننگ۔

ادب میں اصناف اور موضوعات مجبوری کے تحت تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں، ہر عہد کی ضرورت کے مطابق چند مخصوص موضوع اور اس کے مخصوص بیانیہ کو مخصوص سانچوں میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ ماضی میں جاگیر دارانہ معاشرے میں فرصت کے لمحات میں زندگی کا مقصد تفریح تھا لہٰذا ڈھیروں ڈھیر داستانیں لکھی گئیں، مگر عصر حاضر میں بدلتی زندگی، اقدار اور مختلف مسائل نے داستان کی ضرورت کو ختم کر دیا ہے۔ اذکار رفتہ کی وہ چیزیں جن کو سماج کہنہ قرار دیتے ہوئے رد کرتا ہے، بدلتی سماجی و عمرانی اقدار اور وقت ان کو روایت کی نئی شکل عطا کرتا ہے۔ بالکل ایسے ہی ہماری قدیم داستانوں کے پر خطر معرکے، مافوق الفطرت کردار اور طلسم و ساحری کی بازی گری نے جدید ادب کے سانچے میں ڈھل کر سائنس فکشن کی صورت اختیار کی ہے۔ عصر حاضر کے سائنس فکشن میں تخیل اور طلسمانہ کا ایک جہاں آباد ہے جس کا خمیر ہماری قدیم داستانوں سے تشکیل پایا ہے، علاوہ ازیں داستانی ادب میں بالخصوص ہیئت و تکنیک اور بالعموم قصہ، کہانی، واقعات، فضا، علامت و رموز اور حسن و عشق پر کی گئی تنقید سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جدید ناول و افسانہ اور جدید شاعری میں یہ تمام چیزیں داستانی ادب سے اخذ کرنے کے بعد اور جدید طرز زندگی سے مطابقت کرکے انداز نو میں پیش کی گئی ہیں جس سے جدید نظم و نثر دونوں سطح پر اظہار کو وسعت ملی ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ عبد الحق، مولوی (مرتب)، سب رس، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعت ششم، ۲۰۰۹ء)، ص ۷

۲۔ محمود شیرانی، حافظ، سب رس (قصہ حسن و دل)، مشمولہ احوال و نقد وجہی، مرتب: محمد حیات خاں سیال، (لاہور: نذیر سنز، ۱۹۶۷ء)، ص ۷۸

۳۔ عیسوی خاں بہادر، قصہ مہر افروز و دلبر، مرتب: مسعود حسین خاں، (نئی دہلی: انجمن ترقی اُردو، اشاعت دوم، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۸

۴۔ تحسینؔ، میر محمد حسین خاں، نو طرز مرصع، مرتب: نور الحسن ہاشمی، (الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی اتر پردیش، ۱۹۵۸ء)، ص ۴۴

۵۔ ارتضیٰ کریم، عجائب القصص۔ تنقیدی مطالعہ (جلد اوّل)، (دہلی: زلالہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۲۷

۶۔ حیدریؔ، حیدر بخش، آرائش محفل، مرتب: سید سبط حسن، (لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۱

۷۔ آرزو چودھری، داستان کی داستان، (لاہور: عظیم اکیڈمی، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء)، ص ۳۵۱

۸۔ جین، گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعت سوم، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۴۹۔ ۳۶۸۔ ۳۹۲۔ ۶۰۶

۹۔ جیلانی کامران، مذہب عشق، مشمولہ تنقید کا نیا پس منظر، (لاہور: مکتبہ ادب جدید، بار اوّل، ۱۹۶۴ء)، ص ۱۰۶

۱۰۔ مظفر علی سید، الف لیلہ۔ ایک تعارف، مشمولہ داستاں در داستاں، مرتب: سہیل احمد خاں، (لاہور: قوسین، بار اوّل، ۱۹۸۷ء)، ص ۵۱۔ ۵۲

۱۱۔ محمد سلیم الرحمن، شر پر روح کی فتح، مشمولہ داستاں در داستاں، مرتب: سہیل احمد خاں، ص: ۲۳

۱۲۔ وقار عظیم، سید، ہماری داستانیں، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۰۔ ۸۸۔ ۱۶۲۔ ۳۰۲

۱۳۔ فاروقی، شمس الرحمن، ساحری، شاہی، صاحب قرانی۔ داستان امیر حمزہ کا مطالعہ (جلد اوّل: نظری مباحث)، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۱۹۹۹ء)، ص ۵۲۴

14۔ جین، گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، ص ۷۹۲

15۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر نیر مسعود کی تصنیف ''رجب علی بیگ سرور (حیات اور کارنامے)''، (الہ آباد: اسرار کریمی پریس، طبع اوّل، ۱۹۶۷ء)، محمد حسن عسکری کی ''انتخاب؛ طلسم ہوش ربا''، (لاہور: نگارشات، ۲۰۱۶ء)، اور ڈاکٹر آغا سہیل کی، ''دبستان لکھنو کے داستانی ادب کا ارتقاء''، (لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء)

16۔ فاروقی، شمس الرحمن، ساحری، شاہی، صاحب قرانی۔ داستان امیر حمزہ کا مطالعہ (جلد اوّل: نظری مباحث)، ص ۱۴۴